© rasailojaraid.com

رسائل و مسائل

مولانا اسلم جیراج پوری کے جواب پر ایک نظر

(اشاعت گزشتہ میں جناب مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری کا وہ مضمون درج کیا جا چکا ہے جو انھوں نے "تفہیمات قرآن" پر میرے تبصرے کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔ افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کے سبب سے میرا جواب الجواب ساتھ ساتھ شائع نہ ہو سکا۔ ناظرین اس کو ملاحظہ فرماتے وقت مولانا کے مضمون کو پیش نظر رکھیں تو سمجھنے میں آسانی ہوگی)

یہ بات پہلے ہی صاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں عام مسلمانوں کے کسی ایسے عقیدہ کا معتقد نہیں ہوں جس کا ثبوت کتاب و سنت میں نہ ہو۔ ایسے تمام عقائد کے خلاف "صدائے احتجاج" بلند کرنے میں آپ کے ساتھ میں بھی شریک ہوں۔ مگر جن باتوں کا ثبوت کتاب اللہ و سنت رسول میں موجود ہو، ان کے خلاف جو صدائے احتجاج بلند کی جائیگی، اسکی تائید کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے، بلکہ میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

آپنے جو عبارتیں اپنی طرف سے کتاب کے متن یا حاشیہ میں تفسیر و تشریح کے طور پر لکھی ہیں ان کے متعلق میں نے آپ کی اس تصریح کا احترام ملحوظ رکھا ہے کہ آپ کو ان پر اصرار نہیں ہے، اور یہ کہ آپ "انکو اپنی تحقیق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی نہیں دیتے کہ کوئی صاحب ان پر اعتراض کی زحمت گوارا کریں"، لیکن جب آپ کسی آیت کی متعدد احتمالی تاویلات میں سے کسی ایک تاویل کو بیان فرمائیں گے اور اسکی تائید میں دلائل پیش کریں گے، تو میں یہ سمجھنے میں یقیناً حق بجانب ہونگا کہ آپکے نزدیک وہی تاویل راجح ہے، اور اگر میرے نزدیک آپ کی ترجیح درست نہ ہو، اور اس کے بجائے کسی دوسری تاویل کے حق میں مجھکو زیادہ قوی دلائل نظر آئیں، تو مجھے حق ہونا چاہیئے کہ آپکی ترجیح پر اعتراض کروں اور اس دوسری تاویل کی تائید کروں۔ آپنے اپنی رائے ظاہر کر کے قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والوں کو غور و فکر کا ایک راستہ دکھایا ہے۔ میں اس رہنمائی میں کہیں کہیں غلطی محسوس کرتا ہوں، اور یہ بتادینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ راستہ جو دکھایا گیا ہے، سیدھا راستہ نہیں ہے۔ اگر آپ اس راستہ کی استقامت ثابت کر دیں گے تو میں مان لونگا۔ اور اگر میں اسکی غلطی ثابت کر دوں تو آپ مان لیجیئے۔ بحث کا مدار انشاء اللہ قرآن مجید ہی رہے گا۔ اس سے باہر نہ آپ جائیے اور نہ میں جاؤنگا۔

جن و انس | جن و انس کے متعلق قرآن میں ایسی کوئی تصریح مجھے نہیں ملی جس سے یہ شبہ بھی کیا جاسکے کہ جہاں کہیں جن و انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آتے ہیں وہاں جن کے معنی آتشیں جن کے نہیں ہیں بلکہ انسانوں ہی کے ایک طبقہ کے ہیں۔ جو شیاطین اور جن حضرت سلیمان کے تابع تھے ان پر انسان ہونے کا گمان آپ نے اس بنا پر کیا ہے کہ :-

اولاً وہ نظر آتے تھے اور انسانوں کے سے کام کرتے تھے مثلاً معماری، غوطہ خوری ظروف سازی وغیرہ

ثانیاً تاریخ "خود تورات" وغیرہ سے آپ کو ان مزدوروں کا حال معلوم ہو چکا ہے جو حضرت سلیمان نے مصر سے بلوائے تھے۔

لیکن پہلی وجہ اس طرح دور ہو جاتی ہے کہ غیر مادی مخلوقات کو خواہ وہ نوری ہوں یا ناری، اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت عطا فرمائی ہے کہ وہ بشری شکل میں متمثل ہوں، اور مرئی و محسوس بن جائیں۔ چنانچہ سورۂ **ھُود** کے ساتویں رکوع میں ذکر ہے کہ فرشتے حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے سامنے بشری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شکل میں آئے۔ اور حضرت لوط کی قوم نے ان کو کم سن نوجوانوں کی شکل میں دیکھا۔ اور سورۂ مریم کے دوسرے رکوع میں بیان ہوا ہے کہ فرشتہ حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے انسانی شکل میں متمثل ہوا اور اس نے آپ سے کلام کیا۔ جنگ بدر اور اُحد میں فرشتوں کی شرکت کا ذکر بھی قرآن میں آیا ہے، حتیٰ کہ انہی کی شرکت کی وجہ سے مسلمان کافروں کو اپنے سے دو چند نظر آنے لگے۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آتشیں جنوں اور شیاطین کا مرئی و محسوس بن جانا اور انسانوں کے سے کام کرنا مستبعد نہیں ہے۔

رہی دوسری وجہ تو مجھے تعجب ہے کہ آپ قرآن کی تفسیر قرآن سے کرنے کا دعویٰ بھی فرماتے ہیں اور قرآن کے معانی متعین کرنے کے لیے قرآن سے باہر بھی جاتے ہیں۔ پھر قرآن سے باہر بھی آپ گئے تو کہاں؟ تاریخ میں جو کم از کم حدیث سے تو بہت زیادہ غیر یقینی چیز ہے۔ اور توریت میں جس کا محرّف ہونا تمام اہل قرآن کے نزدیک مسلّم ہے۔ آپ نے خود قرآن سے کیوں نہ پوچھا کہ حضرت سلیمان کے پاس جو جن اور شیاطین تھے وہ کس قسم کے تھے؟

قرآن میں بیان ہوا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھ کو ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کو سزاوار نہ ہو۔ هَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّن بَعْدِي۔ اس دعا کو قبول کیا گیا اور اس شکل میں قبول کیا گیا کہ ہوا اُن کے تابع کر دی گئی۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ۔ شیاطین (یا جن) ان کے بس میں کر دیے گئے وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَغَوَّاصٍ (۳۸ : ۳۰) ان کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی اور ان کے لشکر میں پرندے شامل کیے گئے۔ قَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ .... وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ وَالطَّيْرِ (۲۷ : ۲) نہ صرف پرند بلکہ دوسرے جانوروں کی بولیاں بھی ان کو سکھائی گئیں جیسا کہ سورۂ نمل میں ارشاد ہوا ہے کہ جب سلیمان کا لشکر وادی النمل میں پہنچا تو ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں سے کہا کہ اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان اور اس کے لشکر تم کو کچل نہ ڈالیں۔ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ۔ یہ قول حضرت سلیمان نے سن لیا اور وہ اس کو سمجھ کر ہنس دیئے۔ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّن قَوْلِهَا (۲۷ : ۲) یہ سب باتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت سلیمان کو ان کی دعا کے جواب میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو چیزیں دی گئی تھیں وہ غیر معمولی تھیں، اور ان کے بعد کسی اور کو عطا نہیں ہوئیں۔ اگر شیاطین اور جنوں سے مراد ایسے آدمی لیے جائیں جو غوطے لگانے والے، اور برتن اور عمارتیں بنانے والے ہوں، تو اس میں کوئی بات غیر معمولی نہ ہوتی، اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت سلیمان کے بعد ایسے آدمی کسی اور کو نصیب نہیں ہوئے۔ بلکہ اگر آپ کے ارشاد کے مطابق "تاریخ اور خود توریت" کی شہادت مان لی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ غوطہ خور اور معمار تو خود حضرت سلیمان کے عہد میں مصر کے بادشاہ کو حاصل تھے اور حضرت سلیمان نے ان کو شاہ مصر سے درخواست کر کے، نہ کہ خدا سے دعا کر کے حاصل کیا تھا۔

تاہم اگر اب بھی آپ کو ان شیاطین اور جنوں کے آتشیں شیاطین اور جن ہونے میں شک ہے تو سورۂ نمل کا تیسرا رکوع ملاحظہ فرمایئے۔ قرآن مجید خود آپ کا شک رفع کر دیگا۔ جب حضرت سلیمان کے پاس ملکۂ سبا کا جواب پہنچتا ہے تو آپ اہل دربار سے خطاب کر کے پوچھتے ہیں۔ أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ - تم میں کون ہے جو ملکۂ سبا کا تخت میرے پاس اٹھا لائے، قبل اس کے کہ اہل سبا میرے پاس مطیع ہو کر آئیں؟ اس پر جنوں میں سے ایک عفریت کہتا ہے کہ میں اسکو لے آؤں گا قبل اسکے کہ آپ اپنے مقام سے اُٹھیں۔ قَالَ عِفْرِيتٌ مِنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ

اِس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ جن جس نے یہ دعویٰ کیا تھا، آتشیں جن ہی تھا۔ کیونکہ کوئی انسان اسپر قادر نہیں ہے کہ جنوب عرب سے کوئی چیز فلسطین تک چند ساعتوں میں اُٹھا لے جائے۔

مفہوم خلافت خلافتِ آدم کے متعلق قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"، آپ فرماتے ہیں کہ یہاں "خلیفہ" سے مراد پرانے ساکنین ارض کا خلیفہ ہے اور اس کے سوا اس آیت کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہے لیکن اس معنی پر اصرار، اور دوسرے معنی کے احتمال سے انکار کیلئے آپکے پاس کوئی قرآنی دلیل نہیں ہے، اس لئے آپ نے یہ خیالی دلیل پیش فرمائی ہے کہ آدم کو خلیفۂ حق قرار دینے میں حق تعالیٰ کی کسر شان ہے، اور یہ کہ بغدادیوں کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ "خلیفۃ اللہ" و "ظل اللہ" کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الفاظ وہ سانچے ہیں جن میں انھوں نے استبداد کے بت دینی روپ میں ڈھالے تھے، لیکن مجھے قرآن کے معانی متعین کرنے کے لیئے قرآن سے باہر جانے اور بغدادیوں کی تاریخ یا تخیل کی دنیا میں سند تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود قرآن ہی میں ایسے اشارات پاتا ہوں جن سے خلافت کی یہ تاویل راجح قرار پاتی ہے کہ اس سے مراد حق تعالیٰ ہی کی خلافت ہے۔ اس کے لیے آیات ذیل ملاحظہ ہوں:-

قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۷ : ۱۵)

موسیٰ نے کہا کہ قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور زمین میں تم کو خلیفہ بنائے پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْئًا (۱۱ : ۵)

اور میرا رب تمہارے سوا دوسری قوم کو خلیفہ بنائیگا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴ : ۷)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیئے ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انکو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔

ان تمام آیتوں میں لفظ "استخلاف" وارد ہوا ہے جس کے معنی آپ کو لغت کی ہر کتاب میں اپنا خلیفہ بنانے کے ملیں گے۔ استخلفہ ای جعلہ خلیفۃ لہ۔ اسکی تائید ایک دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت داؤد سے فرمایا گیا ہے کہ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ (۳۸ : ۲) "ہم نے تجھ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے"، اس میں کوئی اشارہ اس طرف نہیں ہے کہ ہم نے تجھ کو پہلے بادشاہوں کی جگہ مقرر کیا ہے۔ اگر یہ کہنا مقصود ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ انا جعلنٰک فی الارض خلیفۃ للذین کانوا من قبلک۔ پس جب منوب عنہ کا ذکر نہیں ہے، اور نائب بنانے کا ذکر ہے تو معنی یہی ہونگے کہ نائب اسی کا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس نے اسکو نائب مقرر کیا ہے۔ یہ کہنا کہ "میں نے تم کو فلاں شخص کا نائب مقرر کیا"، اور معنی رکھتا ہے، اور یہ کہنا کہ "میں نے تم کو نائب مقرر کیا"، دوسرے معنی ظاہر کرتا ہے۔ دونوں کا فرق اتنا نازک نہیں ہے کہ تھوڑے سے تامل سے واضح نہ ہو جائے۔

آپ کو نیابتِ حق کی تاویل قبول کرنے میں اس لیے تامل ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کی کسرِ شان ہے اور وہ نائب کا محتاج ٹھیرتا ہے۔ لیکن یہ شبہ نیابت کے مفہوم پر غور نہ کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ نیابت کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ منوب عنہ حاضر نہ ہو، یا مر گیا ہو یا عاجز ہو۔ بلکہ کسی ماتحت کا درجہ بڑھانے اور اسکو عزو شرف بخشنے کے لیے بھی نائب کے مرتبہ سے سرفراز کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ انسان کو حق تعالیٰ نے علم و ادراک، تمیز و اختیار، قدرت و ارادہ، اور تصرف فی الاشیاء کی وہ قوتیں عطا فرمائی تھیں جو کائناتِ ارض کی کسی دوسری مخلوق کو عطا نہیں کیں، اور زمین میں جو کچھ تھا اسی کے لیے پیدا کیا تھا (خلق لکم مافی الارض جمیعًا ۲ : ۳) اور زمین و آسمان کی تمام قوتیں اس کے لیے مسخر کر دی تھیں (وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۴۵ : ۲) اور دنیا میں حضرت حق کے بعد اور کوئی موجود انسان سے اشرف نہ تھا۔ اسلیے انسان کو نائب کے خطاب سے سرفراز فرمایا، تاکہ ایک طرف اس کے شرف کا اظہار ہو اور دوسری طرف خود اس میں اپنے مرتبہ کی بلندی کے ساتھ اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کا بھی احساس پیدا ہو، وہ خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکے، اور خدا کی بخشی ہوئی چیزوں میں تصرف کرتے وقت یہ یاد رکھے کہ وہ ان چیزوں کا مالک نہیں ہے بلکہ اصل مالک کا نائب ہے، اور اصل مالک کی رضا اور اس کے مقرر کیے ہوئے قوانین کے خلاف تصرف کرنے کا اسکو حق نہیں ہے۔ نیابتِ حق کے تصور میں یہی وہ معنی فتیں ہیں جن کو آپ "شاعری"، قرار دیتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ "بغدادیوں"، نے خلیفۃ اللہ اور ظل اللہ کے الفاظ کو ان کے اصل مفہوم سے پھیر کر، ڈکی اسپرٹ کے خلاف ظلم و استبداد کے لیے استعمال کیا، تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآن کے منافی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تعیین میں کسی بغدادی یا کسی دمشقی کے فعل کا کیا دخل ہے؟ بغدادیوں نے تو اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ کے سانچے میں بھی استبداد کے بت ڈھالے تھے، وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ کو بھی ظلم کے لئے استعمال کیا تھا۔ پھر کیا آپ ان سب سانچوں کو توڑ دیں گے جن میں ظالموں نے اپنی سرکشی سے استبداد کے بت ڈھالے تھے؟ آپ قرآن کی تفسیر قرآن سے کر رہے ہیں یا بغدادی تاریخ سے؟

آدم کا گناہ

آدم علیہ السلام کے متعلق "ساری دنیا" جو کچھ کہتی ہے اس سے مجھے کچھ سروکار نہیں مجھے صرف اس سے بحث ہے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن کا ارشاد ہے کہ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ (پھر اس کے رب نے اسکو برگزیدہ کیا اور اسکی توبہ قبول کر لی)۔ آپ فرماتے ہیں کہ قبول توبہ اور عفو و مغفرت میں فرق ہے۔ مگر میں قرآن سے پوچھتا ہوں تو وہ کہتا ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے ارشاد ہوتا ہے کہ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵:۶) یہاں یتوب علیہ کے معنی پر ان اللہ غفور رحیم کا فقرہ روشنی ڈال رہا ہے۔ اگر یہاں قبول توبہ کے معنی معاف کر دینے اور بخش دینے کے نہیں ہیں تو کیا اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے گا اور نیکوکار بن جائے گا، اللہ اسکی توبہ قبول کرلے گا مگر اسے معاف نہیں کرے گا؟ ایک دوسری جگہ حق تعالیٰ بنی اسرائیل کو اپنے احسانات یاد دلاتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب تم نے بچھڑے کی پرستش کرنے کے بعد موسیٰ کے کہنے سے توبہ کی تو ہم نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۲:۶) کیا اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ اللہ نے تمہاری توبہ قبول کی مگر تمہیں معاف نہیں کیا؟ اگر یہی مفہوم ہے تو پھر احسان کس چیز کا جتایا گیا ہے؟ ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے کہ تم روزوں کی راتوں میں چھپ چھپ کر اپنی بیویوں سے مباشرت کرتے تھے۔ اللہ کو تمہاری اس حرکت کا علم ہے مگر اس نے تمہیں معاف کر دیا۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ (۲:۲۳) یہاں عفا عنکم کے الفاظ تاب علیکم کی تفسیر کر رہے ہیں۔ سورہ نساء میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ نادانی سے برا فعل کرتے ہیں پھر جلدی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے توبہ کر لیتے ہیں، اللہ انکی توبہ قبول کرلیتا ہے۔ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ (۴ : ۳) کیا اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ اللہ ان کو معاف نہیں کرتا صرف توبہ قبول کرتا ہے؟ سورۂ توبہ میں ہے کہ جن لوگوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا اور اچھے اور برے دونوں طرح کے عمل کیے، امید ہے کہ اللہ ان کو بھی بخش دیگا عَسَى اللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۹ : ۱۳) کیا یہاں خدائے غفور و رحیم کی یہی شان بیان کی گئی ہے کہ وہ توبہ قبول کر لیتا ہے مگر بخشتا نہیں؟ سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیم کی دعا کے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں:- وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۲ : ۱۵) کیا اس دعا کا یہ مفہوم ہے کہ خدایا! تو ہماری توبہ قبول کر مگر ہمیں معاف نہ کر؟ ان تمام آیات میں خود قرآن مجید نے قبول توبہ اور عفو و مغفرت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ پھر اس کتاب کے وہ کون سے حقائق ہیں جن کا سمجھنا "توبہ، مغفرت اور عفو وغیرہ" کے درمیان فرق کرنے پر موقوف ہے؟

آپ نے قبول توبہ اور مغفرت کا فرق صرف اس بات سے نکالا ہے کہ حضرت آدم کی توبہ قبول کرنے کے باوجود ان کو جنت سے نکالا گیا۔ اس شبہ کا ایک جواب میں اپنی تنقید میں پہلے ہی دے چکا ہوں مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس جواب سے آپ مطمئن نہیں ہوئے اب میں ایک دوسرے پہلو سے اسکو دفع کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس سے مطمئن ہو جائیں گے۔ قرآن مجید میں آدم علیہ السلام کے قصے کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان پر غور کیجیے۔ جنت کے قیام کی یہ کیفیت تھی کہ وہاں انسانی خواہشات اور حاجات نہ تھیں اور نہ بشری احساسات تھے (إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ۲۰ : ۷) ان احساسات کا سرچشمہ وہ تھا جس کو قرآن نے "درخت" سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت حق نے آدم اور انکی بیوی کو ہدایت فرمائی تھی کہ اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم اپنے اوپر آپ ظلم کرو گے (وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ۲ : ۴) شیطان نے ان کو دھوکہ دیا۔ اور کہا کہ تمہارے پروردگار نے تم کو اس درخت سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لیئے منع کیا ہے کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ اور تمہیں ہمیشہ کی زندگی نہ ملے (مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخٰلِدِينَ ۲:۷) آؤ میں تم کو بقائے دوام کے درخت کا مزا چکھاؤں (هَلْ أَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۲۰:۲۰) آدم اپنے اس دشمن کے دھوکے میں آگئے، اور وہ ان کو شجرۃ الخلد کے پاس لے جانے کے بجائے اس چیز کی طرف لے گیا جس کی خاصیت یہ تھی کہ انسان کی بشری کمزوریوں کو نمایاں کردے، اس میں جنسی احساس (Sexal instinct) پیدا کردے، اسکو اپنے جسم کے ان مخصوص مقامات کا راز بتادے جو اس وقت تک اس سے چھپے ہوئے تھے، اور اس کے اندر وہ جذبات پیدا کردے جو آپس کی دشمنی کے لیئے محرک ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس درخت کا مزا چکھتے ہی یہ سب خصوصیات نمایاں ہوگئیں اور بشری کمزوریوں پر جو پردہ پڑا ہوا تھا، یکایک اٹھ گیا (فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا .... فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۲:۷) جب یہ چیز پیدا ہوگئی تو آدم اور انکی بیوی کے اندر جنت میں رہنے کی صلاحیت باقی نہ رہی۔ ان خصوصیات کے نمایاں ہوجانے کے بعد ان کے لیئے زمین ہی مناسب جائے قیام تھی اس لیئے ان سے کہہ دیا گیا کہ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلٰى حِينٍ (۲:۴) "جاؤ اب زمین ہی تمہارے لیئے جائے قرار ہے جہاں تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے"۔ اب جنت تمہارا پیدائشی مقام نہیں رہا بلکہ اب جنت میں آنا تمہارے عمل پر موقوف ہوگا۔ جو ہماری بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل کرے گا وہ جنت میں آئے گا اور جو نافرمانی کریگا وہ دوزخ میں جائے گا۔ (فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۲:۴) یہ حکم سزا اور انتقام کے طور پر نہ تھا۔ بلکہ اس "شجر" کا مزا چکھنے کا طبیعی نتیجہ یہی تھا کہ آدم اور انکی بیوی قیام جنت کے قابل نہ رہیں اور زمین میں رہنے کے قابل ہوجائیں۔ آدم علیہ السلام نے توبہ کی اور وہ قبول بھی ہوئی، مگر قبولِ توبہ کی صحیح صورت یہ نہ تھی کہ حق تعالیٰ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی سنت کے خلاف ان کے فعل کے طبعی نتیجہ کو بدل دیتا، بلکہ اسکی صحیح صورت یہ تھی کہ انھوں نے حکم خداوندی کے خلاف جو نافرمانی کی تھی اسکو معاف کر دیا گیا، وہ راندۂ درگاہ ہونے کے بجائے برگزیدہ ہوئے اور ان کو راہ راست کی طرف ہدایت بخشی گئی (وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ۔ ۲۰:۷) اس کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے کوئی شخص شراب پیئے اور شراب کے اثر سے اس کے اعضائے رئیسہ خراب ہو جائیں۔ پھر وہ توبہ کرلے حق تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق اسکو معاف کر دیگا، مگر اس معافی کی صورت یہ نہ ہوگی کہ اس کے نظام جسمانی میں شراب کی طبعی تاثیر سے جو خرابی واقع ہو گئی ہے اسکو قبول توبہ کے ساتھ ہی دور کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایک حرام اور ممنوع چیز استعمال کرنے کی پاداش میں اسپر جو عتاب ہونا چاہیئے تھا وہ نہ ہوگا اور اس گناہ پر اس سے کوئی باز پرس نہ کی جائے گی۔ شرابی کے فعل کے دو اجزا ہیں: ایک اس کا شراب پینا جو اپنی ایک مخصوص تاثیر رکھتا ہے۔ دوسرے اس کا حکم خداوندی کی خلاف ورزی کرنا جس کا نتیجہ حق تعالیٰ کا عتاب ہے۔ شرابی جب توبہ کرے گا اور اسکی توبہ قبول کی جائے گی، تو دوسرا جزء ساقط ہو جائے گا۔ لیکن پہلا جزء اپنے نتائج کے ساتھ باقی رہے گا۔ بالکل اسی طرح حضرت آدم کا شجرۂ ممنوع کے قریب جانا بھی دو اجزاء پر مشتمل تھا۔ ایک ان کا نفس فعل جس کی ایک مخصوص تاثیر تھی۔ دوسرے ان کے فعل کی یہ حیثیت کہ وہ فرمان الٰہی کے خلاف تھا۔ جب حضرت آدم نے توبہ کی اور وہ قبول ہو گئی تو دوسرا جزء اپنے نتیجہ (یعنی عتاب الٰہی) کے ساتھ ساقط کر دیا گیا۔ مگر پہلا جزء بحال رہا جس کا نتیجہ ہبوط تھا۔

مسئلہ غلامی

غلامی کے مسئلہ میں قرآن مجید نے یہ بات مسلمانوں کے اختیار پر موقوف رکھی ہے کہ خواہ احسان کے طور پر اسیران جنگ کو رہا کریں خواہ فدیہ (بصورت نقد یا بصورت مبادلۂ اسیران) لے کر چھوڑ دیں۔ یہ کہیں حکم نہیں دیا ہے کہ اگر دوسری صورت نہ ہو تو پہلی صورت پر عمل کرنا لازم ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ فطرت انسانی سے واقف ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ اگر معاملہ دو چار یا دس پانچ قیدیوں کا ہو تو مسلمان بطیب خاطر ان کو بطور احسان رہا کر سکتے ہیں، جیسا کہ انھوں نے عہد رسالت اور عہد صحابہ میں بارہا کیا ہے۔ لیکن اگر سینکڑوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہزاروں قیدیوں کا معاملہ ہو تو ایسی صورت میں جبکہ مسلمانوں کے بھی سینکڑوں ہزاروں آدمی کفار کے پاس قید ہوں اور ان کو غلام بنا کر رکھا گیا ہو، مسلمانوں کے لیئے یہ بہت مشکل ہوگا کہ وہ کفار کے آدمیوں کو محض احسان کے طور پر رہا کر دیں۔ اس دوسری صورت میں اسیران جنگ کی رہائی کے لیئے صرف یہی ایک راستہ کھلا ہوا ہے کہ یا تو وہ زر فدیہ ادا کر کے رہا ہوں یا اسیران جنگ کا مبادلہ ہو۔ اب اگر اسیران جنگ زر نقد ادا کر سکتے ہوں اور کفار سے مبادلہ کا معاملہ طے نہ ہو سکے، اور کفار کے ان مسلمان قیدیوں کی حیثیت مملوکوں کی سی ہو، جیسی کہ فی الواقع ہزار برس بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ تک رہی ہے، تو کیا وجہ ہے کہ اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حق نہ ہو کہ وہ کفار کے قیدیوں کو غلام بنا کر رکھیں؟ آپ اس مسئلہ پر ان حالات کی روشنی میں غور فرما رہے ہیں جبکہ غیر مسلم قوموں میں اسیران جنگ کو غلام بنانے کی رسم موقوف ہو چکی ہے، مبادلہ اسیران کا طریقہ عام طور پر رائج ہو چکا ہے اور وہ حالات باقی نہیں رہے جن میں اسیران جنگ کو غلام بنانے پر مسلمان مجبور ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کو غلامی کے اسلامی قانون کا جواز تسلیم کرنے میں تامل ہو رہا ہے۔ لیکن اگر آپ ان حالات پر نظر رکھیں جو اب سے سو برس پہلے تک دنیا میں رائج رہے ہیں، تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی قانون میں غلامی کے لیئے جو گنجائش رکھی گئی ہے وہ بے جا نہیں ہے۔ یہ درحقیقت قرآن مجید کا کمال حکمت ہے کہ اس نے غلامی کے مسئلہ میں ایسا حکم دیا جس میں وقت کے حالات کی رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی تھی، اور آئندہ کے لیئے ایک اصلاحی قانون بھی بنا دیا گیا تھا تاکہ جب وہ حالات بدل جائیں تو آپ سے آپ وہ قانون نافذ ہو جائے۔

آپ نے غلامی کے مسئلہ پر جو اظہار خیال فرمایا ہے اس کا پہلا مقدمہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی رو سے غلامی ناجائز ہے۔ اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ صحابہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم اسیران جنگ کو غلام بناتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ اور اہل بیت کا فعل قرآن کے خلاف اور ناجائز تھا۔ آپ تاریخی حدود میں جا کر اور اسباب و حالات کی مجبوریوں پر بحث فرما کر خواہ کیسا ہی کافی اور شافی جواب عطا فرمائیں، مگر خود آپ کے اپنے مقدمات سے جو منطقی نتیجہ نکلتا ہے اس پر آپ کسی طرح پردہ نہیں ڈال سکتے۔ آپ کو نہ صرف یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خلفائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

راشدین، اور اصحاب رسول اور اہل بیت رسول علیہم الرحمہ کا فعل قرآن مجید کے حکم کے خلاف اور ناجائز تھا، بلکہ آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ معاذ اللہ قرآن مجید نے قبل از وقت ایک ایسا غیر حکیمانہ قانون بنا دیا تھا جس میں وقت کے حالات کی کوئی رعایت ملحوظ نہ رکھی گئی تھی، جس پر ۱۳ سو برس تک عمل کرنا دشوار رہا، اور جس پر وہ لوگ بھی عمل درآمد نہ کر سکے جو خاص سرکار رسالت مآب کے تربیت یافتہ تھے اور جنھوں نے اپنی زندگیوں کو اسلامی تعلیم کے سانچے میں ڈھالنے کی وہ انتہائی کوشش کی تھی جو کسی انسان کے امکان میں ہے۔

یہ محض منطقی قیاس ہی نہیں ہے بلکہ اگر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آیت فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً کے جو معنی آپ بیان فرما رہے ہیں اگر وہی اسلام کا قانون قرار پاتے تو مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ اور قطعًا ناقابل عمل ہوتے۔ اس قانون پر عمل درآمد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر کفار زر فدیہ ادا نہ کریں اور اسیران جنگ کا مبادلہ بھی قبول نہ کریں تو مسلمان بہر صورت ان کے قیدیوں کو رہا کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر مسلمانوں کا قانون یہی ہوتا تو کوئی کافر قوم اتنی احمق نہ تھی کہ زر فدیہ ادا کرتی یا مسلمانوں کے قیدیوں کو رہا کر دیتی۔ اس صورت میں لاکھوں مسلمان کفار کے ہاتھ قید ہوتے اور کبھی رہا نہ ہو سکتے، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلامی کی مصیبت میں گرفتار رہتے؛ اور اس کے مقابلہ میں کافروں کے آدمی ہر لڑائی کے بعد آزاد ہو جایا کرتے۔ آپ ہی فرمایئے کیا ایسا قانون منصفانہ کہا جا سکتا ہے؟ اور کیا کسی زمانہ میں اسیر انسان عمل کر سکتے ہیں؟

ملکیت زمین | آپ نے اس مسئلہ میں خلط بحث کر دیا۔ اور میرے اصل اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ نے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اس آیت کی رو سے زمین کی شخصی ملکیت جائز نہیں ہے۔ اس پر میرا اعتراض دو حیثیتوں سے ہے:-

ایک یہ کہ نظام تمدن میں ایسی انقلاب انگیز اساسی ترمیم کے لیے محض اتنا سا اشارہ کافی نہیں ہے۔ اگر قرآن کا منشا یہی ہوتا جو آپ فرما رہے ہیں تو وہ صاف الفاظ میں نہ صرف پرانے دستور کو بند کرنے کا حکم دیتا بلکہ آیندہ کے لیے زمین سے انتفاع کا نیا طریقہ بھی بتا دیتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے یہ کہ اگر قرآن مجید کا منشا یہی تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مطابق عمل کیوں نہیں کیا؟ آنحضرت صلعم کی بعثت کا اصل مقصد یہی تھا کہ عقائد، اخلاق، معاشرت، تمدن ہر چیز میں قرآنی احکام کے مطابق اصلاح فرمائیں، اور دنیا میں قرآن کا قانون جاری کر دیں - وہ حالات کی بندگی کرنے کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ خدا کی بندگی کرنے کے لیے آئے تھے - ان کا کام دنیا کی روش پر چلنا نہ تھا، بلکہ دنیا کی روش کو بدل کر قرآن کی بتائی ہوئی روش پر چلانا تھا - اب اگر ایک طرف آپ کے قول کے مطابق یہ مان لیا جائے کہ قرآن کا مقصد زمین کی شخصی ملکیت کو مٹانا تھا، اور دوسری طرف اس ناقابل انکار حقیقت کی طرف نظر کی جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پرانے دستور کو نہیں مٹایا بلکہ اسی کے مطابق عمل کرتے رہے، تو لامحالہ دو باتوں میں سے ایک بات ماننی پڑے گی - یا یہ کہ قرآن کے اس مقصد سے آنحضرت صلعم خود بے خبر تھے - یا یہ کہ حضور کو اس کا علم تھا مگر آپ نے قرآن کے اس حکم پر عمل نہ کیا اور قرآن کے بتائے ہوئے دستور پر اس دستور کو ترجیح دی جو رضائے الٰہی کے خلاف دنیا میں رائج تھا - فرمائیے کہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کون سا پہلو آپ اختیار کرتے ہیں؟

میرے ان اصولی اعتراضات سے پہلو تہی کر کے آپ نے قرآن کے متعلق اپنے زاویہ نگاہ کی تشریح شروع کر دی جس سے معاملہ سلجھنے کے بجائے اور زیادہ الجھ گیا - آپ کی اس تشریح سے یہ بات کھل گئی (جو پہلے ذرا چھپی چھپی تھی) کہ آپ قرآن مجید کی زیر بحث آیت کو اشتراکیت (Com munism) کے سانچے میں ڈھال کر دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کا وہ علاج کرنا چاہتے ہیں جسے کارل مارکس نے تجویز کیا اور لینن نے عملی جامہ پہنایا - اس نقطہ نظر سے آپ کو چاہیے تھا کہ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ کے بجائے خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (۲ : ۳) سے فائدہ اٹھاتے تاکہ نہ صرف زمین بلکہ جملہ اقسام کے مال و دولت کی شخصی ملکیت ناجائز ٹھیرتی، زمین کے جانور بھی (جن پر آپ نے از روئے قرآن شخصی ملکیت کا حق تسلیم کیا ہے) تمام انسانوں کی مشترک ملکیت قرار پاتے، روپیہ پیسہ بھی (جس میں خود آپ کے اعتراف کے مطابق قرآن نے زکوٰۃ اور وراثت کے قوانین جاری کیے ہیں) تمام انسانوں میں مساوات کے ساتھ تقسیم ہوتا، اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک ہی وہلہ میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کا ایسا سدباب ہوتا کہ اسلام اور کمیونزم بغلگیر نظر آنے لگتے۔

اسلام اور ایمان قرآن مجید میں لفظ اسلام دو معنوں میں استعمال ہوا ہے :-

ایک لغوی معنی جو اطاعت و انقیاد کا مترادف ہے۔ مثلاً وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳ : ۷۷) اور اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (۲۷ : ۳) اس معنی میں اسلام، ایمان سے علیحدہ ہے۔ اور اسی معنی کے لحاظ سے قالت الاعرابُ آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا (۴۹ : ۲) فرمایا گیا ہے۔

دوسرا۔ اصطلاحی معنی جس میں "اسلام" خدا کے برگزیدہ اور پسندیدہ دین کا نام ہے (اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ) اس معنی میں اسلام کے متحقق ہونے کے لئے ایمان کا متحقق ہونا ضروری ہے، اور جب تک کوئی شخص مومن نہ ہو، وہ اس معنی میں مسلم نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں یہ اصطلاحی "اسلام"، ایمان کا ہم معنی آیا ہے۔ مثلاً يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ (۱۰ : ۹) اور قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ...... وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲ : ۱۶) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا نام اسی دوسرے معنی میں "مسلم" رکھا ہے۔ اسی معنی میں حضرت ابراہیم ؑ نے اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہا۔ اور اپنی اولاد کو وصیت کی کہ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲ : ۱۶) اسی معنی میں اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۳ : ۲) کہا گیا ہے، اور رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵ : ۱) کہہ کر اسے پسندیدگی کی سند عطا کی گئی ہے۔

آپ نے ان دونوں معنوں میں کوئی فرق نہیں کیا اور لکھ دیا کہ "اسلام اور ایمان میں ظہور اور بطون کا فرق ہے۔ اللہ نے ظہور کی بنیاد پر ہمارا نام مسلم رکھا ہے"۔ پھر آپ اس سے بھی آگے بڑھ گئے اور آپ نے یہ دعویٰ کیا کہ مسلمان کو ایمان کا دعویٰ کرنے سے روکا گیا ہے۔ یہ بات قرآن مجید کی تصریحات کے خلاف تھی؛ اور اسی پر میں نے اعتراض کیا تھا نہ کہ معاذ اللہ قرآن پر۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسئلہ تقدیر اس مسئلہ کے متعلق میں نے جو کچھ عرض کیا تھا آپ نے اس پر غور نہیں فرمایا۔ میری گزارش یہ تھی کہ عقیدۂ تقدیر اسی طرح ایمان باللہ کے اجزاء میں سے ہے جس طرح خدا کو سمیع، علیم، بصیر، وغیرہ ماننا۔ جب تک انسان کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا صحیح علم حاصل نہ ہو اور یہ علم ایمان کی صورت اختیار نہ کرلے، اسوقت تک ایمان باللہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا عقیدۂ تقدیر بہرحال ایمانیات سے ہے، خواہ آپ اسکو ایمان مجمل میں شامل قرار دیں یا ایمان مفصل میں۔ حضرت یوسف کے بھیڑیئے کی برأت سے اگر انسان خالی الذہن ہو تو ایمان میں نقص واقع نہ ہوگا۔ لیکن اگر تقدیر کے عقیدہ سے انسان خالی الذہن ہو تو ایمان ناقص ہوجائے گا اور عمل پر اس کا اثر پڑے گا۔ ان دونوں باتوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ آپ جیسے صاحب علم کا اس سے چشم پوشی کرنا قابل تعجب ہے۔ کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عقیدۂ تقدیر پر کتنا زور دیا ہے۔ کتنی کثرت سے مختلف مواقع پر اسکو پیش کیا ہے، اور کیسے کیسے اخلاقی فوائد اس عقیدہ پر متفرع ہوتے ہیں؟

اتباع علماء صلحاء آیۂ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ سے میں نے جو استدلال کیا تھا اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ یہ آیت خاص طور پر علماء اہل کتاب سے وحی کی تصدیق چاہنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ میں بھی جانتا ہوں کہ آیت کی شان نزول یہی ہے۔ مگر کیا اس سے یہ بات نہیں نکلتی کہ جس مسئلہ کے متعلق آدمی کو کافی واقفیت نہ ہو یا جس میں اسکو کچھ شک ہو، اس کے بارے میں اہل علم سے سوال کرنا چاہیئے؟ آپ نے اپنے مدعا کی تائید میں جو آیت پیش کی ہے وہ تو میری پیش کردہ آیت سے بھی زیادہ میرے مدعا کی تائید کرتی ہے۔ اس میں تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے کہ اگر آپ کو شک ہو تو اہل کتاب کے علماء سے دریافت کرلیجیے۔ غور فرمایئے کہ جب نبی کو یہود و نصاریٰ کے علماء سے دریافت کرنے کی ہدایت ہوتی ہے، تو عام مسلمانوں کے لیے مسلمان علماء سے دین کے مسائل دریافت کرنا کیونکر ناجائز ہوسکتا ہے؟ اسی طرح اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ کے متعلق آپ کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیائے سابقین کا اقتداء کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ میں بھی جانتا ہوں کہ ایسا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی ہے۔ مگر کیا اس آیت سے یہ قاعدۂ کلیہ نہیں نکلتا کہ جو لوگ ہدایت یافتہ ہوں اور خدا کی بتائی ہوئی راہ راست پر چلتے ہوں انکی پیروی کرنی چاہیئے؟ آپ فرماتے ہیں کہ علماء و صلحاء کے کسی قول کو بلا قرآنی سند کے اصل دین سمجھ لینا قطعی شرک ہے۔ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ جو شخص کسی انسان کے قول کو خدا کے قول کے برابر درجہ دے، یا خدا کے قول کو چھوڑ کر کسی انسان کا قول اختیار کرے وہ مسلمان نہیں ہے۔ لیکن آپ فرمایئے کہ اگر کوئی مسلمان خود کتاب کا علم نہ رکھتا ہو، اور کسی صاحب علم سے کتاب کے احکام اور کتاب کی تعلیمات دریافت کرے، اور اسکی بتائی ہوئی باتوں کو یہ سمجھ کر قبول کرے کہ اس نے جو کچھ بتایا ہے کتاب کے مطابق بتایا ہے، وہ آخر کس گناہ کا مرتکب ہوتا ہے؟ اور قرآن کی کونسی آیت کی رو سے اسکو مشرک یا گنہگار قرار دیا جا سکتا ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ علماء کی کوئی بات نہ مانو جب تک کہ وہ قرآنی سند نہ پیش کریں۔ مگر آپ نے غور نہیں کیا کہ قرآنی سند کو جانچنا عالم کا کام ہے نہ کہ عامی کا۔ جو شخص خود اتنا علم نہ رکھتا ہو کہ قرآنی سند کو جانچ کر عالم کی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکے، اس کے لیے تو بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ جس عالم کے علم اور تقویٰ پر اسکو اعتماد ہو اسکی بات مان لے، اور یہ سمجھتے ہوئے مان لے کہ اس کا قول کتاب و سنت کے مطابق ہی ہوگا۔ اگر جاہل عامیوں میں یہ اسپرٹ پیدا ہو جائے کہ وہ علماء کے بتائے ہوئے مسائل کو نہ مانیں اور خود اپنے ناکافی علم کے ساتھ قرآن کا الٹا سیدھا مطلب سمجھ کر اجتہاد کرنا شروع کر دیں تو مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں سخت ابتری پھیل جائے گی۔ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ چننے لگا۔ آج آپ ۷۲ فرقوں کو روتے ہیں، مگر اس صورت میں تو فرقوں کا شمار لاکھوں سے بھی متجاوز ہو جائے گا بلکہ سرے سے کوئی جمعیت باقی ہی نہ رہے گی۔

© rasailojaraid.com